علامہ اقبال کا تصورِ

''عشق و مستی''

ڈاکٹر سید تقی عابدی

علامہ اقبال نے مولانا رومؔ سے متاثر ہو کر یہ بھی کہا ہے۔

پیر رومؔی مرشد روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر

علامہ اقبال کے تصور عشق و مستی پر کوئی خاص کام ابھی تک نہ ہو سکا یوں تو عشق، عشق و خرد عشق و دل، عشق و علم اور عشق کے مترادفات شوق، وجود، جنون، محبت، مودت، ولا، جذب وغیرہ کی ترکیبات پر گفتگو نظر آتی ہے لیکن اقبال کی ترکیب ''عشق و مستی'' جس کا امیر رومؔی ہے وہ تشنۂ تاویل و تشریح ہے۔ علامہ اقبال نے اس ترکیب ''عشق و مستی'' کو اپنے اردو اور فارسی کلام میں تقریباً تمیں سے زیادہ بار استعمال کیا ہے۔ اور ہر مقام پر اس کے معنی تقریباً یکساں ہیں جسے آسان الفاظ میں معرفت الٰہی اور عشق نبویؐ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ ترکیب ''عشق و مستی''، ''عشق مستی'' نہیں ''مستی عشق'' نہیں ''عشق مستی'' مستانہ عشق یا عشق مست نہیں بلکہ صرف اور صرف ''عشق و مستی'' ہے۔ اگرچہ اقبالؔ کے یہاں یہ ترکیب تمیں سے زیادہ مقامات پر نظر آتی ہے لیکن یہ مشاہیر فارسی اور اردو شعراء کے پاس نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہی نہیں اگر مولانا رومؔ کی مثنوی مصنوی جس میں تقریباً ساڑے چوبیس ہزار اشعار ہیں اور ان کے دیوانِ کبیر جس کو دیوان شمس تبریزی کہتے ہیں تقریباً چالیس ہزار اشعار موجود ہیں یہ ترکیب ''عشق و مستی'' خال خال ہے۔ ہمیں اس ترکیب اور تصور ''عشق و مستی'' جو اقبالؔ کی فکر کا نیا افق ہے سمجھنے کے لیے پہلے عشق اور مستی کو جداگانہ پھر ان دونوں حالتوں کو اکائی کی شکل میں علم کلام کی روشنی کے ساتھ داخلی واردات اور وجدانی منازل سے گزرنا ہوگا اور اس ترکیب کی تحلیل اور تجلیل کا تجزیہ کرنے کے لیے اقبال ہی کے کلام سے استفادہ کرنا ہوگا۔ راقم نے اس تصور ''عشق و مستی'' پر اپنی جدید تصنیف ''اقبال کے چار مصرعے'' میں مفصل گفتگو کی ہے۔

عشق یہ سہ حرفی عربی لفظ قرآن حدیث نبویؐ، شعرا جاہلیت اور صدر اسلام کے کلام اور عربی ادبیات میں نظر نہیں آتا۔ اگر عشق کے لفظ کی تاریخی اہمیت پر تحقیق کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ متاخرین عربی شعرا نے اس لفظ کا استعمال کم کیا ہے۔ عشق کے لفظ کا استعمال اور اس کی تمام ترکیفیات پر تفصیلی گفتگو سب سے پہلے فلسفۂ اشراق میں ملتی ہے۔ عشق کے مطالب و معانی قرآن و حدیث اور شعراء صدر اسلام میں محبّ، محبت، مودت اور ولا جیسے ہم معنی الفاظ سے ادا کئے گئے ہیں۔ محبت، محبوب، محبّ، حبیب کس مادے سے نکلے ہیں اس میں اختلاف ہے مگر اکثر علمائے ادبیات کا خیال ہے کہ یہ لفاظ ''حب'' سے مشتق ہے۔ حب کے معنی وہ گڑھا ہے جس میں گدلا پانی بھرا ہو جس کی وجہ سے نظر اس سے گزر نہ سکے یعنی جب دل محبت سے بھر جاتا ہے تو اس میں محبوب کے سوا کسی اور کے لیے جگہ نہیں ہوتی اس میں کسی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ بعض علمائے ادب نے ان الفاظ کو ''حباب الماء'' سے مشتق کیا ہے جس کے معنی بارش کا تیز بہتا ہوا پانی جو تھم نہیں سکتا چنانچہ محبت بھی جوش دل ہی ہے اور یہ تھم نہیں سکتی۔ بہر حال عشق اور محبت ہم معنی الفاظ ہیں چنانچہ شریعت اور طریقت میں یہ الفاظ مترادفات کے طور پر ملتے ہیں۔ مختلف علما نے عشق و محبت کی مختلف تعریفیں کی ہیں جن کا ذکر اس مختصر سی تحریر میں ممکن نہیں صرف اصطلاحی معنی کو واضح کرنے کے لیے چند نکات کو یہاں پیش کرتے ہیں۔

جناب سہیل بن عبداللہ عشق و محبت کو محبوب کی عبادتوں سے تمسک اور محبوب کے احکام کی مخالفت سے برات بتاتے ہیں۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کے نظریہ کے تحت عشق و محبت میں اپنے زیادہ کو کم اور محبوب کے کم کو زیادہ سمجھنا ہے۔ امام غزالیؒ نے محبت و عشق کو کس چیز کے اچھے ہونے کی وجہ سے پسندیدگی اور چاہت کے ارتقاء سے تعبیر کیا ہے اور اس کے خلاف کسی چیز کے برے ہونے کی وجہ سے نفرت اور بیزاری کا نام دیا ہے۔ کشف المحجوب میں حضرت داتا گنج بخش نے عشق و محبت کے معنی کسی چیز کا حد سے زیادہ شوق ہونا بتایا ہے۔ بعض علمائے مشائخ صرف بندہ سے خدا کا عشق روا جانتے ہیں اور خدا کا بندہ سے عشق نہیں مانتے کیونکہ عشق و محبت کی صفات میں فراق شرط ہے اور ان مشائخ کے نظریہ میں بندہ کا خدا سے وصال ہوگا۔ بعض مشائخ طریقت بندہ سے خدا اور خدا سے بندہ کا عشق یا محبت روا نہیں مانتے کیونکہ عشق یعنی حد سے بڑھ جانا چنانچہ بندہ کے عشق میں خدا محدود ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس خشک ذہنی راہ پیمائی کا حاصل یہ ہے کہ فلسفہ عشق و محبت میں کئی مکتب خیال اپنے اپنے نظریوں پر قائم ہیں۔ عراقی کہتا ہے۔

بہ عالم ہر کجا درد دلی بود
بہم کردند و عشقش نام کردند

اقبالؔ اپنی نظم محبت میں کہتے ہیں

یہ جوہر اگر کارفرما نہیں ہے
تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی
نہ محتاج سلطاں نہ مرعوب سلطاں

محبت ہے آزادی و بے نیازی
مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

اقبالؔ کی نظر میں عشق ومحبت کس طرح بنائے گئے اس کی جھلک ان اشعار میں ملتی ہے

چمک تارے سے مانگی چاند سے داغ جگر مانگا
اُڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفس پائے مسیح ابنِ مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی
ملک سے عاجزی افتادگی تقدیرِ شبنم سے
پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے

عطار کہتے ہیں:

عاشقاں را با خود باھیچ کس تدبیر نیست
عین وشین وقاف را اندر کتب تفسیر نیست

میر تقی میر فرماتے ہیں۔

سخت کافر تھا جس نے پہلی بار
مذہب عشق اختیار کیا

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

ولیؔ دکنی فرماتے ہیں:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا
گر نہیں راہ عشق سے آگاہ
فخر بے جاہ ہے فخر رازی کا

ہم یہ کہہ رہے تھے کہ عشق کے لفظ کو شیخ الاشراق کی کتاب حکمتہ الاشراق کے بعد نیا مقام حاصل ہوا اور بعد میں یہ لفظ عشق حقیقی سے زیادہ عشق مجاز کا سرمایہ بنا۔ اردو شعروادب اور فلسفہ میں عشق کے معانی اور مطالب پر فارسی کا گہرا اثر رہا ہے عشق کی بیشتر واردات ہمیں فارسی سے ورثہ میں ملی ہیں۔ چنانچہ عشق کے لوازمات جن میں سوز وگداز، وصل وفراق، فنا وبقا، آرزو وسعی، حیات و ممات، خودی وبیخودی، فکروذکر، دل ودید وغیرہ شامل ہیں فارسی ادب سے شدید متاثر ہیں جن کی صاف گونج ہمارے مشاہیر بخصوص تصوفی شعرا کے کلام میں سنائی دیتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اقبال بھی میر تقی میرؔ کی طرح عشق کو اپنا امام اور عقل کو اپنا غلام بتاتے ہیں۔ لیکن امام عشق میرؔ اور رہبر عشق اقبالؔ کے لوازمات عشق اور ان کے مقاصد اور نتائج میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

میرؔ وصال کے خواہاں ہیں تو اقبالؔ فراق کے دلدادہ۔ میرؔ فنا کو مقصد زیست سمجھتے ہیں تو اقبالؔ بقا کو، میرؔ حیات اور ممات کے درمیان دم لینے کے قابل ہیں تو اقبالؔ پیہم تسلسل اور تغیر کے ساتھ سکوت اور سکونت کے خلاف ہیں۔ میرؔ بے آرزو مردادلی کیفیت سے دوچار ہیں تو اقبال آرزو اور تمنا کو زندگی کا مزا جانتے ہیں۔ میرؔ کی خودی میں بیخودی ہے تو اقبال کی بیخودی میں خودی ہے۔ چنانچہ میرؔ کی طرح یہ تاثرات اردو کے دوسرے شعرا کے کلام جن میں دردؔ، غالبؔ، آتشؔ، فانی وغیرہ سرفہرست ہیں ہمارے بیان پر دال ہیں۔ ساڑھے سات سو سال قبل پیر رومیؔ نے فخر الدین رازیؔ کی معقولات اور منطقی گفتار کو تفسیر وتاویل کے لیے مضر جانا کیوں کہ مولانا رومؔ عقلی دلایل اور منطقی محسوساتی ادراک کو جذبات اور وجدان کو سمجھنے کا پیمانہ نہیں مانتے تھے۔ مولانا رومؔ فرماتے ہیں منطق اور استدلال کے پاؤں لکڑی کے پاؤں کی طرح تکلیف دہ ہوتے ہیں اگر عشقیہ اور وجدانی واردات کی عقل رہبر ہوتی تو آج فخر الدین رازیؔ دین کے رموز سے واقف ہوتے۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود
اندرین بحث از خرد رہ بیں بود
فخر رازیؔ راز دار دیں بود

اور اسی راز کو مرید رومیؔ اقبالؔ نے بھی محسوس کیا اور اسی لیے فرمایا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے رازیؔ کا سرمہ دھو دیا ہے، یا کیوں قرآن کے معنی رازیؔ سے پوچھیں؟

چو سرمہ رازیؔ را از دیدہ فروشتم
چہ رازیؔ معنی قرآن چہ پرسی؟
نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی
جیتا ہے رومیؔ ہارا ہے رازیؔ

اقبالؔ رومیؔ ہی کی صدائے برگشت کو نئے طریقہ سے چار مصرعوں میں پیش کرتے ہیں۔

جمال عشق ومستی نے نوازی
جلال عشق ومستی بے نیازی
کمال عشق ومستی ظرف حیدرؓ
زوال عشق ومستی حرف رازیؔ

یعنی رازیؔ کی معقولات، منطقی استدلال، محسوسات سے جذب

وحال کی کیفیات کی تشریح عشق ومستی معرفت الٰہی کے زوال کے باعث ہے۔یہ عشق ومستی کا راستہ عشق حضور اکرم ﷺ سے ہوتا ہوا رب اللعالمین تک پہنچتا ہے۔اقبال کہتے ہیں جانتے ہو عشق ومستی کہاں سے ہے یہ حضور اکرم ﷺ کے سورج کی ایک کرن ہے۔

می ندانی عشق ومستی از کجاست
ایں شعاعِ آفتابِ مصطفیٰؐ است

نگاہ عشق ومستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طاھا

عشق ومستی کی انتہا اس کے حصول میں کمال کا حاصل کرنا ہے جس کا حامل رومی کا ''انسان کامل''نطشے کا''سوپر مین''الجیلی کا''مرد کامل''ہائیڈگر کا ''مرد یقین''اور اقبال کا''مرد مومن''،''مرد مجاہد''اور''عبدہ''ہوتا ہے اور یہی مرد کامل راز دار معرفت الٰہی، حاصل رضائے الٰہی اور لایق نیابت الٰہی ہے۔یہ راستہ عشق کی قوت اور مستی کی طاقت سے طے ہوتا ہے جہاں بے خودی خودی کا جوہر بن جاتی ہے جہاں شراب انسانی خون سے نشہ میں چور ہو جاتی ہے جیسا کہ امیر عشق ومستی رومی اپنی غزل میں کیفیت مستی کو ظاہر کرتے ہیں۔

مائیم ہمیشہ مست بی مئے
مائیم ہمیشہ شاد بی ما

(ہم ہمیشہ مست ہیں بغیر شراب کے اور ہم ہمیشہ خوش ہیں بیخودی میں)

باید کہ جملہ جاں شوی تالایق جاناں شوی
گر تو سوی مستاں شوی مستانہ شو مستانہ شو

(محبوب کے لایق ہونے کے لیے مادی کثافتوں سے پاک ہو کر سرتا پا جان ہونا چاہیے میخانہ مستی میں جانے کے لیے مست اور سرمست رہو)

زجام عشق سرمستم دو عالم رفت از دستم
بجز رندی و قلاشی نباشد ہیچ سامانم
الا ای شمس تبریزی چناں مستم درین عالم
کہ جز مستی و قلاشی نباشد ہیچ درمانم

میں عشق کے جام سے مست ہو گیا اور کائنات میرے ہاتھوں سے نکل گئی اب صرف مستی اور فقر کے سوا میرا سامان کچھ بھی نہیں۔اے شمس تبریزی اس دنیا میں تو ایسا مست ہو گیا کہ اس کا علاج سوائے مستی اور فقر کے کچھ اور نہیں ہوسکتا۔

رومی امیر''عشق ومستی'' کے کلام کا اثر اردو شعرا پر کہیں زیادہ اور کہیں کم نظر آتا ہے۔اگرچہ عطار، سعدی، سلیمان ساوجی، حافظ کے علاوہ برصغیر کے فارسی شعرا جن میں خسرو، عرفی، نظیری، کلیم، فیضی، قدسی، بیدل، اور ناصر علی نے بھی ہمارے اردو کے متقدمین اور متوسطین شعرا پر گہرے نقش چھوڑے ہیں لیکن مولانا روم کی فکر اور ان کے ذکر کا رنگ نمایاں اور صاف نظر آتا ہے اور بعض اشعار تو مولانا روم کے شعروں کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔

خدائے سخن میر تقی میر ذکر میر میں لکھتے ہیں جب وہ آٹھ نو سال کے تھے تب ان کے والد اور چچا نے انہیں نصیحت کی''بیٹا عشق اختیار کرو۔عشق ہی اس کارخانہ پر مسلط ہے اگر عشق نہ ہوتا تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔عشق میں دل کھونا کمال بندگی ہے۔عالم میں جو کچھ ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے یہ خاک قرار عشق ہے یہ ہوا اضطرار عشق ہے یہ پانی رفتار عشق ہے یہ آگ سوزش عشق ہے موت مستی عشق ہے حیات بیداریٔ عشق ہے۔''ہم ان تمام مضامین کو مولانا روم کے اشعار میں دیکھ سکتے ہیں۔یہی نہیں بلکہ میر، درد، اور غالب کے اشعار پر بھی رومی کی تاثیر عیاں ہے۔حزین نے تصوف برائے شعر گفتن کی روایت اُن شعرا کے کلام سے متاثر ہو کر لکھی جن کے ساغروں میں رومی کی صراحی سے انڈیلی گئی شراب عشق ہے۔ذیل کے اشعار جو مشاہیر اردو شعرا کے کلام سے لیے گئے ہیں ان میں رومی کی صدائے برگشت صاف گونج رہی ہے۔

عشق میں لازم ہے اوّل ذات کو فانی کرے
ہو فنا فی اللہ دائم باز نیر دانی کرے
(ولی)

اہل فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوح مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے
(درد)

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
(درد)

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمایش سراب کی سی ہے
(میر)

سخت کافر تھا جس نے پہلی بار
مذہب عشق اختیار کیا
(میر)

پاتے ہیں اپنے حال میں مجبور سب کو ہم
کہنے کو اختیار ہے پر اختیا رکیا
(میر)

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

(غالب)

ابتدائے عشق و مستی قاہری است
انتہائے عشق و مستی دلبری است

(اقبال)

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک ہیں قوموں کے مزار

(اقبال)

رومی عشق کی دولت سے سرشار اور معرفت کے نشہ سے مست ہے۔ رومی، شریعت جو صرف احکام کے مثبت اور منفی نظام کا نام ہے یعنی مثلاً نماز پڑھو شراب مت پیئو وغیرہ سے آگے بڑھ کر طریقت میں محو کامل ہو جاتا ہے اور پھر تیسرے زینۂ معرفت حقیقت میں حیرانی اور تجلی میں کھو جاتا ہے۔ اقبال اگر چہ مرید رومی ہے لیکن وہ بھی حقیقت کی منازل پر سیر کرتا نظر آتا ہے اور اسی لیے اقبال کو ترجمان حقیقت کہا ہے۔ رومی کہتے ہیں۔

بادہ از ما مست شد نے ما ازو
قالب از ما ہست شد نے ما ازو

(شراب ہمارے نشہ سے مست ہوگئی ہم شراب سے مست نہ ہوئے۔ پیکر خاکی ہماری وجہ سے موجود رہا نہ ہم اس پیکر کے وجود سے)

مولانا روم کی غزل میں مست کی تکرار کا مزا لیجئے اور مست ہو جایئے

میر مست و خواجہ مست و یار مست اغیار مست
باغ مست و راغ مست و غنچہ مست و خار مست
آسمان چند گردی گردش عنصر ببین
خاک مست و آب مست و باد مست و نار مست
حال صورت این چنین و حال معنی خود مپرس
روح مست و عقل مست و وہم مست افکار مست

(آسمان کب تک گردش کرتا رہے گا ذرا گردش عناصر اربعہ دیکھ یعنی خاک، آب، آگ اور ہوا جس سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے وہ سب مست ہیں۔ ہمارے وجد اور حال کی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ ہم سے ہمارا احوال مت پوچھ روح عقل گمان اور فکر سب مست ہیں) اسی لیے تو علامہ اقبال نے کہا تھا

ہم خوگر محسوس ہیں ساحل کے خریدار
اک بحر پر آشوب و پُر اسرار ہے رومی
تو بھی ہے اسی قافلہ شوق میں اقبال
جس قافلہ شوق کا سالار ہے رومی
اس عصر کو بھی اس نے دیا ہے کوئی پیغام
کہتے ہیں چراغ رہ احرار ہے رومی